ہوا تحریر کر مجھ کو!

ہوا تحریر کیر مُجھ کو!

AUTHOR

Wazir Agha
115/3, Sarwar Road
Lahore Cant., Pakistan
Contact: +92.42.6676378

ہوا تحریر کر مجھ کو!

وزیر آغا

کاغذی پیرہن

ہوا تحریر کر مجھ کو ــــ نظمیں ــــ وزیر آغا

وسیم جگنو نے ٹی جے پرنٹرز، رائل پارک، لاہور سے چھپوا کر
کاغذی پیرہن، عظیم مینشن، رائل پارک، لاہور سے شائع کی

اشاعتِ اوّل : جنوری ۲۰۰۹ء
مشینی خطاطی : ورڈ میکرز
سرورق : ریاظ
قیمت : ۱۲۵ روپے

Hawa, Tehreer ker Mujh ko!
(*Urdu* Poems by *Wazir Agha*)

Printed by:
T. J. Printers, Lahore, Pakistan

Price:
In Pakistan: Rs.125.00
Abroad: US$. 8.00 or Euro.6.00 or UK Pound.5.00

Published by:
Kaghadhi Paerahen
Azeem Mansion, Royal Park
Lahore, Pakistan
Tel: +92.42.6848533 - Cell: +92.321.4649684
Email: kaghadhipaerahen@hotmail.com

ISBN 978-969-8527-75-4

فیصل ہاشمی کے نام

ہوا تحریر کر مُجھ کو!

پیش لفظ

نظمیں

وزیر آغا کی نظمیں

وزیر آغا کی نظمیں، شعورِ ذات اَور تعینِ خود کے عصری مَفاہیم کی تفسیر ہیں۔ مَوجُود کو نیاتی تناظر میں، تازہ فِکری و عِلمی پس مَنظر کے ساتھ اِنسانی باطن میں اُترنے اَو ہونے نہ ہونے کی حقیقت دریافت کرنے کا عمل وزیر آغا کے یہاں بہت نمایاں ہے۔ ایک ہی معنیاتی کُل میں بنی ہُوئی اِن نظموں میں دو آوازیں بہ تکرار اُبھرتی اَو اَپنا آپ نقش کرتی ہیں۔ اِن میں سے ایک، توانا و تابندہ اَور ہونے کے اِثبات کی کہانی ہے۔ یہ بھیگی چاپ بن، دستک میں ڈھل مقفّل بستیوں کو نیند سے بیدار کرنے، بجل ماتھوں کی قوسوں پر، سیہ آنکھوں کے حلقوں پر، لرزتے بند ہونٹوں پر تحریر ہو کر، اِنھیں زِندگی دینے اَور اِک اِک سمت "ہونے" کا میلہ لگائے رکھنے کی آرزُو مند ہے۔ دُوسری آواز ایک گھاؤ اَندر گھاؤ کہانی، پہاڑوں میں دراڑیں، دراڑوں سے دُھواں، اَندر ہی اَندر جل بُجھنے کی کیفیت سے متعلّق ہے۔ وزیر آغا نے اِن دونوں آوازوں کو کبھی جُدا جُدا اَور کبھی باہم ایک کر کے مصوّر کیا ہے۔ اِس تصویر کشی میں فکری ریاضت، وِجدانی تجربے کی جِدّت اَور حسی اِدراک کی جَودَت، لفظوں کے ساتھ وارِد ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اِن مختصر مگر مُنضبط نظموں میں بلا کی جاذبیت ہے۔

"ہوا" اَور "آواز" وزیر آغا کے محبُوب اِستعارے ہیں۔ اِن اِستعاروں کی جتنی متنوّع جہات اَور اِمکانات اُن کے ہاں ظاہر ہُوئے ہیں، مُعاصر نظم میں اُس کی نظیر کم ہے۔ یہ دو اِستعارے زِندگی، اُس کی

روانی، خبر، حیرت اَور دیگر کئی مفاہیم اَور دبیز معنیاتی پرتوں کے حامل ہیں۔ وزیر آغا کی یہ نظمیں عُمر کے اُس حصّے کی تخلیقات ہیں، جب مَوجُود اَور نا مَوجُود کے روابط کا اِدراک گہرا ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اِن نظموں میں ہَوا اَور آواز کے اِستعارے، مزید گہرے مفاہیم کے ساتھ آئے ہیں۔

وزیر آغا کی نظمیں، مجموعی طَور پر، نظم کے خالص آہنگ سے تعلّق رکھتی ہیں جو مکمّل طَور پر غزل کے آہنگ سے جُدا ہے۔ اُردو کی اکثر نظمیں، اَپنے فنّی برتاؤ میں غزل کے بہت قریب ہو جاتی ہیں لیکن وزیر آغا اُن نظم کہنے والوں میں سے ہیں جنھوں نے غزل اَور نظم کے آہنگی اَور فنّی برتاؤ میں فرق ملحُوظ رکھّا ہے۔ جدید اُردو نظم میں اُن کی مُنفرِد پہچان (موضُوع اَور برتاؤ) دونوں حوالوں سے مَوجُود ہے۔

ڈاکٹر رشید امجد

نظمیں

ہَوا تحریر کر مُجھ کو!

ہَوا تحریر کر مُجھ کو
زمیں کی سِلوٹوں پر
دُور تک پانی کی شِکنوں
بادلوں کے گھنگرالے نرم بالوں پر!
ہَوا تحریر کر مُجھ کو
سُنہری پتّیوں کی زرد رِخیوں پر
پھلوں پھُولوں کی کومل
جِلد پر اُبھری لکیروں

اوِر جلے جنگل کی
خَم کھائی ہُوئی بے برگ شاخوں پر!
ہَوا تحریر کر مُجھ کو
سِجل ماتھوں کی قوسوں پر،
سِیہ آنکھوں کے حلقوں پر،
لرزتے بند ہونٹوں پر
کہ یہ سب منتظِر ہیں
کب میں اُتروں لفظ بن کر
اَور اِن میں جان پڑ جائے!!

جنوری ۲۰۰۷ء

ترسیل

خموشی، راستہ مت روک میرا
کہ مَیں برکھا کی بھیگی چاپ بننا چاہتا ہُوں
وہ بھیگی چاپ جو دستک میں ڈھل کر
مقفّل بستیوں کو نیند سے بیدار کرتی ہے!
خموشی، راستہ مت روک میرا
مجھے گہرے گھنے جنگل میں
مِنقاروں سے گِرتے آبشاروں
میں نہانا ہے

مہکتی ندیوں کی توتلی باتوں کو سُننا ہے
مجھے حرفوں کے اُن تنکوں کو چھُونا ہے
جو جُڑ کر لفظ بنتے ہیں
سجل آواز کی بُوندوں میں ڈھلتے ہیں
جو میرے اَور تیرے درمیاں
ترسیل کی زنجیر بن جانے پہ قادِر ہیں
خموشی، راستہ مت روک میرا!!

اکتوبر ۲۰۰۷ء

پچاسیویں سال گرہ

اَے صَدا'

اَے برف کے بے اَنت صَحرا پر جُھکی

نامختتم —

اِک رَوشنی کی دھار اَیسی

سِیمگوں ٹھنڈی صَدا!

اَے بے نیاز اوِر بے تعلّق

ہر طرح کی پھڑپھڑاہٹ سے تہی

آفات سے نا آشنا

اِک مسلسل گُونج

جس کی اِبتدا اوِر اِنتہا

نظروں سے اوجھل

سوچ کے پھیلاؤ سے بھی ماوَرا

اَے صَدائے بے نہایت

اَے زمانوں کے خس و خاشاک

کی آندھی سے پاک

اَور تھوڑی دُور

میرے ساتھ ساتھ!!

مئی ۲۰۰۷ء

RENOVATION

کوئی بتلاؤ

اِس خستہ مکاں کی عُمر اَب کیا ہے

جو سارے گھاؤ

اَپنے ہات کی پوروں پہ گنناچاہتا ہے!

دراڑیں

جُھرّیاں

دیمک کے ناخن سے چِھدی لیکیں

بِیہ لکڑی کے فرنیچر کے گہرے غار

ٹوٹے فرش کی رِخنیں
وہ سب زخموں کو بھرنا چاہتا ہے
وہ اپنی پُوری ہَیکل کو
نیا اِک پیرہن دے کر
زمانے کو دِکھانا چاہتا ہے
مگر اس کو پتا شاید نہیں ہے
کہ اِس کی خَستہ بنیادوں کے
اَندر بھی تو کتنے گھاؤ
مُنہ کھولے پڑے ہیں!!

اپریل ۲۰۰۶ء

ادھوری کہانی

کہانی نے
شکستہ نیند کی مَوہُوم درزوں
سے اگر جھانکا
تو دیکھے گی
کہ اُس کی لَو میں
کتنی صُورتوں کے خال و خَد
بیدار ہیں!
کتنے پرندے منتظِر بیٹھے ہیں اُس کے

راستے جاگے ہُوئے ہیں!
اور مکاں جس کی
سجیلی بالکونی میں
سدا اِک پھُول سا پیکر مہکتا تھا
وہ پیکر آج بھی اُس کی
ملائم چاپ سُننے کو ترستا ہے
کہانی آئے تو
وُہ اپنی آنکھیں کھول کر
اُس آنے والی کی طرف دیکھے
کہے:
سچ سچ بتا'
مجھ کو ادھورا چھوڑ کر تُو
کس نگر میں جا بسی تھی!!

ستمبر ۲۰۰۵ء

چلو اُن کچّے رستوں پر چلیں!

چلو اِک بار پھر
اُن کچّے رستوں پر چلیں
جن کی کوئی منزل نہیں ہوتی!
وہ رَستے جو سَدا
اپنی ہی جانب مُڑتے جاتے ہیَں
خود اَپنے بے کراں ٹھہرے ہُوئے
قُلزُم کے اَندر

دَم بہ دَم تحلیل ہوتے ہَیں !

چلو، قُلزُم کی تہَ میں بیٹھ کر سوچیں
کہ منزل کس لیے ہوتی ہے
پکّے راستے کیوں اُس کی جانب
سانس کی اُکھڑی ہُوئی
ڈوری سے چمٹے
بے تحاشا دوڑنے پر
اِس قدر مجبُور ہوتے ہَیں !!

دسمبر ۲۰۰۶ء

ذرا دیر پہلے

ذرا دیر پہلے
یہاں کچھ نہیں تھا
نہ سبزہ نہ بادل نہ جھونکا ہوا کا
نہ میدان میں دوڑتے پاؤں کی جوڑیاں
اور نہ گھر میں تنجن کی خوشبو
نہ زینے پہ اُوپر کو جاتی ہوئی چاپ
دھڑکن نہ آنسو نہ تیکھا تبسّم
مُنڈیروں پہ چُپ چاپ بیٹھے کبوتر

نہ گلیوں میں خط بانٹتا کوئی سائیکل!

ذرا دیر پہلے یہاں کچھ نہیں تھا
اور اَب کیا نہیں ہے
اِک اِک سمت
"ہونے" کا میلہ لگا ہے
"نہ ہونے" کا میدان اُجڑا پڑا ہے!!

اگست ۲۰۰۵ء

ایک سوال

گھنے بادل کے کوندے
آگ کی میخوں میں ڈھل کر
ہرے جنگل کے
مخمل میں اُترتے ہیں
چِتا بن کر سُلگتے ہیں!

سمندر، پاگلوں کی طرح
مِیلوں دُور تک پھیلی ہُوئی خشکی کے
چاندی جسم پر
یلغار کرتے ہیں
زمیں کو کترنوں میں

دیر تک تقسیم کرتے ہیں !

زمیں کی کوکھ میں ہیجان اُٹھتا ہے
پہاڑوں سے جُڑے لاکھوں گھرونڈے
تاش کے پتّوں کی صُورت
ہر طرف پرواز کرتے ہیں
زمیں پر سنگِ مَرمَر کے
سِتارے بن کے گِرتے ہیں !

یہ کیا ہے، کس لیے ہوتا ہے یہ
سوچو
مگر یہ بھی تو سوچو
سوچ کے یہ رینگتے سنپولیے
کیوں ذہن کے سُوراخ سے
یُوں جھانکتے ہیں
اِنھیں کس نے اِجازت دی ہے
اِستفسار کرنے کی !!

دسمبر ۲۰۰۵ء

ہَوا بے رِدا ہے

ہَوا بے رِدا ہے
ہَوا کچّی خُوشبُو میں بھیگی
سمندر کے چکنے بدَن پر پھسلتے
اچانک
لپکتی ہے نیندوں بھرے سَبز ساحل
کے خیموں کی جانِب
وہ خیمے کہ جن میں
بَہُت دُور سے آنے والوں
کے بستر بچھے ہیَں

بُجھاتی ہے سڑکوں کے برقی دِیے
اور درختوں کو جَڑ سے
مَکانوں کو بنیاد سے
نوچ کر پھینکتی ہے پَرے
اَور ہنستی ہے!

جب دیکھتی ہے کہ ساحِل
کے بخیے اُدھڑنے لگے ہیں
تو رُک کر
زمیں پر گری فاختہ کے پَروں کو
بڑے پیار سے چُھو کے کہتی ہے:
کس نے تجھے گھر سے بے گھر کیا فاختہ'
فاختہ — فاختہ!!

جنوری ۲۰۰۶ء

SLEEP-WALKING

میں اَپنے گرم بِستر سے نکل کر
اِک پُرانی، تنگ سیڑھی سے اُتر کر
گھر کا آنگن پار کر کے
اِک کُھلے مَیداں میں پہنچا ہُوں
مہکتے، سُرخ پُھولوں سے لدے بھاری شجر
کے سایے میں رکھّے
منوّر بنچ کے بازُو سے لگ کر
رُک گیا ہُوں
بنچ پر چادر میں لپٹی
اِک تھکی آواز سے مَیں پُوچھتا ہُوں:

کون ہو، تم کون ہو ــــ!

آواز کہتی ہے:

مجھے تم خواب میں ملتے تھے

اَب چل کر مجھے ملنے کو آئے ہو

تو بیٹھو بات کرتے ہَیں!

معاً میری سلی آنکھوں کے بخیے

ٹوٹ جاتے ہَیں

معاً آنکھیں مِری کھُلتی ہیں

اوِر مَیں دیکھتا ہُوں

ہر طرف گہرا اندھیرا ہے

شجَر مجھ پر کسی پرچھائیں

کی صُورت جُھکا ہے

اوِر شجَر کی

ناخُنوں ایسی مُڑی شاخیں

مجھے تاراج کرتے جا رہی ہَیں!!

فروری ۲۰۰۸ء

ٹھوکر

گھڑی جب وقت کی ٹھوکر سے
دُنیا کو جگاتی ہے
تو وُہ دہشت زدہ
یک دَم پُھدک کر
خاک پر گرتا
زمیں کی کوکھ میں
کتنے ہی بَل کھا کر اُترتا ہے
جہاں سارے زمانے
نیند کے کالے سمندر کی

تہوں میں جا بہ جا موجود
گھرے جنگلوں کی
لجلجی شاخوں سے چمٹے ہیں
نہ جانے کون سے عالم کے اندر
خستگی اوڑھے پڑے ہیں!

وہ اِک دہشت زدہ
شاخوں سے لپٹے لوتھڑوں کو
توڑ کر
فرشِ زمیں پر پھینکتا پھر
پاؤں کی ایڑی سے اُن کو
روندتا
اِک ٹوٹے پھوٹے قہقہے سے
وقت کی بے وقت مرگِ ناگہاں
کا بے خطر اعلان کرتا ہے!

معاً وُہ نیند کے
کالے سمندر سے نکلتا ہے

کہ اَب خطرہ کوئی باقی نہیں ہے

مگر جیسے ہی بَل کھا کر وہ باہر کے

منوّرِ بُعد میں آتا ہے

باہر کو جھلک اپنی دِکھاتا ہے

گھڑی اِک بار پھر بانہیں ہِلا کر

وقت کی ٹھوکر سے

دُنیا کو جگاتی ہے

نیا منظر دِکھاتی ہے

تو وُہ دہشت زدہ

اِک بار پھر

کالی کلوٹی نیند کے

گہرے سمندر کی تہوں میں

کُود جاتا ہے!!

اپریل ۲۰۰۸ء

خَوف مَت کھاؤ!

فلک کی چھت سے
کالے اَبر کی لیریں
اگر لٹکی ہُوئی ہَیں
تو اِن چمگادڑوں سے
خَوف مَت کھاؤ
کہ یہ سب خُون کی پیاسی
سِیہ، چُڑمُر پَروں سے لیس
چِکنی، لِجلِجی، اَندھی
فقط گہرے اَندھیرے میں
تمھیں تکنے پہ قادِر ہیں
تم اِن سے مَت ڈرو
بس رَوشنی کو گُل نہ ہونے دو!

مارچ ۲۰۰۶ء

کوئی اَندر ہی اَندر جل بُجھا ہے!

پہاڑوں میں دراڑیں پڑ گئی ہیں

دَراڑوں سے دُھواں

آہوں کی صُورت

نظر کی آخری مَوہوم حَد تک

فضا میں

دُور تک پھیلا ہُوا ہے

کوئی اَندر ہی اَندر جل بُجھا ہے

پہاڑوں کو فقط

مٹّی کے ٹِیلے جاننے والو!

پہاڑوں کے بھی اَپنے
پھُول سے اَجسام ہوتے ہیں!
پہاڑوں کی رگوں میں بھی
لہُو موجود ہوتا ہے!!

اکتوبر ۲۰۰۵ء

پنڈورا

ابھی مَیلی کچیلی گودڑی میں
سَفَر، کتنے ہی اَن دیکھے سَفَر
بے حِس پڑے ہیں!
ابھی آئے گا کوئی
اَور مَیلی گودڑی کو کھول دے گا
اِور سَفَر
پھُنکارتے، کتنے ہی بَل کھاتے
زمیں پر چاروں سمتوں میں

بِکھرتے جائیں گے!

اَور تُو

اپنے عَصا سے

خاک کے غازے پہ

بنتی اَور لہراتی لکیریں

پیٹتا رہ جائے گا!!

ستمبر ۲۰۰۸ء

خموشی

خموشی ـــــ اِک لرزتی موم بتی سی
مسلسل رات بھر جلتی ہے
جلنے کی مگر آواز تک آتی نہیں ہے!

خموشی ڈبڈباتے موتیوں میں
بات کرتی ہے
وہ موتی جو پھسل کر،
موتیے کی پتیاں بن کر،

خموشی کے بدن پر دِھیرے دِھیرے
ثَبت ہوتے ہیں!

خموشی مسکراتی ہے
تو سارا ہست، کلیوں سے لدے
رنگین پیکر میں مجسّم ہو کے
کِھلتا ہے
خموشی کی عَجب خُوشبو بھری
چہکار بنتا ہے!!

اگست ۲۰۰۵ء

مسافت ختم ہوتے ہی!

کڑی بھیگی مسافت ختم ہوتے ہی
وُہی بستی اگر پھر سے نظر آئی
تو کیا ہوگا!

تو کیا ہوگا ـــــ
وُہی ہوگا جو ہر قصّے میں ہوتا ہے!
مکاں، ٹوٹے کھلونے بن چکے ہوں گے
مکانوں میں ہوا

جاروب لے کر در بہ در ہو گی
گھٹی گلیوں میں ملبا تا بہ لَب ہو گا
مُنڈیروں سے پرندے جا چکے ہوں گے
کوئی بھی شخص
بَستی میں نظر آئے
نہیں؛ اَیسا نہیں ہو گا
کہ سارے لوگ تو
بَستی سے باہر اِک پہاڑی پر
اُترتی برف کی
ٹھنڈی سلاخوں میں
پروئے جا رہے ہوں گے!!

ستمبر ۲۰۰۵ء

یاد

اَپنے قدموں کی ڈری چاپ سے
جاگی ہے ہَوا
آنکھیں مَلتے ہُوئے
اُٹھ بیٹھی ہَے
پَردہ کھڑکی کا ذرا دیر کو لَرزا ہے
ذرا دیر کو
کھڑکی پہ جُھکی بیل سے
شبنم کے ٹپکنے کی صدا آئی ہَے

دفعتہً ڈبّے سے ٹکرا کے
بڑے زور سے بھاگا ہے کوئی
پھڑپھڑانے کی صدا
نیند میں ڈوبے ہوئے
بھاری پپوٹوں پہ اُتر آئی ہے
گیٹ تک
اَپنے ہی قدموں کے
تعاقُب میں ہَوا
لَوٹ کر جاتے ہُوئے
صاف نظر آئی ہے!

دسمبر ۲۰۰۵ء

مہکار

خوشی کا سونگھنا کیسا اَنوکھا تجربہ ہے!

کبھی گرما کے موسم میں
جَلی جُھلسی ہُوئی اِک شام کو
تم گھر کے کچّے فرش پر
چھاگل سے جَل چھڑکو

تو اک سوندھی گھنیری باس
تم کو تو تلے بچپن
کے جُھولے میں جُھلاتے
دُور اِک جادُو کی نگری کا
عجب خُوشیوں میں لپٹا
خُوشنُما منظر دِکھائے گی!

کبھی تم پَو پھٹے جنگل سے گُزرو
اور گھنی خُوشبُو کا جھونکا تم سے ٹکرائے
تو اِک میٹھی سی سَرشاری
تمھارے ہر بُنِ مُو میں اُتر کر
تم سے پُوچھے گی:
کہو، کیا مجھ کو پہچانا!

کبھی اِک ریشمیں ملبُوس کی مہکار
الماری کے کُھلتے ہی
حَسیں سپنوں کے
حَلقے میں جکڑ کر

تم سے گر پُوچھے:

بتاؤ، یاد ہے تم کو؟

تو بولو، کیا کہو گے تم!

خُوشی کا سُونگھنا

کیسا انوکھا تجربہ ہے!"

دسمبر ۲۰۰۷ء

COMPASSION

آنکھ کی کالی پُتلی میں
اِک بُوند معاً بیدار ہوئی
اور ٹھنڈے ٹھار فلک پر سے
اِک گرم سِتارہ آنسو کا
دِھیرے سے گِرا
اور زخم پہ مرہم رکھ کے کسی نے
آہ بھری
جھونکے کی پوریں جاگ اُٹھیں
شبنم کی برکھا پھیل گئی
اور سارا منظر بھیگ گیا!

اپریل ۲۰۰۷ء

مجھے اچھّا نہیں لگتا!

مجھے دِن بیر کا اچھا نہیں لگتا
بدَن کو دَم بہ دَم، ہر ہر قدم پر
ٹھوکروں کا دان مِلتا ہے
کبھی گاڑی، کبھی رِکشا
کبھی زَن سے گزرتا سائیکل
تارِ نظر کو توڑ دیتا ہے
صَدا کا کان کے دالان تک آنا
بڑا دُشوار ہوتا ہے
کہ رَستے میں ہزاروں ٹُوٹی پھُوٹی
ہر قدم، دم توڑتی چیخیں
صَدا میں بے سبَب آمیز ہوتی ہیں

وہ خُوشبُو جو سجل اِتوار کے
نافے سے پھُوٹی تھی،
خنک نتھنوں کو چھُونے سے بہت پہلے
گھنی، ڈیزل کی اور پٹرول کی بدبُو
پھلوں پھُولوں کے لاشوں کے تعفُّن اور
گٹر سے اُٹھنے والے بُو کے بھبکوں سے
گلے مِل کر عجب اِک چیز بنتی ہے
کہاں خُوشبُو وہ رہتی ہے!

مجھے دِن پیر کا اچھا نہیں لگتا
کہ اُس دِن لاکھوں پنجے
سَر بُریدہ خلق کے جُثّے کے
اَندر سے نکلتے ہیں
جھپٹتے ہیں
مجھے میرے بدَن سے
نوچ لینا چاہتے ہیں!!

اکتوبر ۲۰۰۵ء

دِن چڑھتے ہی!

اَیسے ہے، دِن چڑھتے ہی
جب تارے آنسو بن جاتے ہیں
پتّوں کے چکنے طَشتوں سے
جَست لگا کر
پلکوں کے کانٹوں کی نوک پہ
رُک جاتے ہیں
کاغذ پر بکھری سب خبریں
اِک دھبّا بن جاتی ہیں

اوِر وُہ دھبّا، کالک بن کر
شہروں، سڑکوں اوِر چہروں پر
اپنی اِک منحوس لِپی میں
جانے کیا کچھ لکھ جاتا ہَے!

نومبر ۲۰۰۷ء

کبھی آواز اِک ریشم کی ڈوری تھی

کبھی آواز اِک ریشم کی ڈوری تھی
جو سیدھے اور کُشادہ راستے پر
اَن گِنت پوروں سے ہو کر لیس، بہتی تھی
جہاں کوئی اُسے، بے حس کھڑا
نمناک آنکھوں سے خلا کو گھورتے دِکھتا
تو پوروں سے اُسے چُھوتی
ذرا آگے کو جُھک کر
اپنی بانہوں میں جکڑ لیتی

اُسے اَپنا بنا لیتی
مگر جب سے کسی نے
اُس ازل سے تا اَبد بہتی ہُوئی
ڈوری کو
لاکھوں کترنوں میں کاٹ پھینکا ہے
وہ کاغذ کے پرندوں کی طرح
بے سمت ہو کر رہ گئی ہے
ہَوا کا رِزق بنتی جا رہی ہے!

جنوری ۲۰۰۷ء

سات پَردوں کے پار

مُشتعِل چڑیوں کا
مدھ مکھیوں کا
اِک اَندھا غُبار
میرے سَر کے گِرد چکراتا ہُوا
اَور مَیں بے اِختیار
ایک پتھر کے مَکاں
کے آہنی دَر سے لگا
لَب مقفّل
اَور چابی وقت کے گِرداب
کی پاتال میں
پَردوں کے پار!

مئی ۲۰۰۷ء

گُم شُدہ

دروازہ

اِک پتھر کی دِیوار کے اَندر

چُھپا پڑا ہے

اَپنے نام سے جُڑا ہُوا وُہ دروازہ

اَور کسی بھی نام سے جس نے

کُھل جانا سیکھا ہی نہیں ہے

اور مَیں اُس کا نام نہ جانے

کب کا یکسر بُھول چُکا ہُوں

کتنے لُغات ٹٹول چُکا ہُوں

جادُو کا وُہ شَبد مجھے مِلتا ہی نہیں ہے!

جون ۲۰۰۷ء

پروجیکٹر

چلو، چلّو میں بھرلیں ہم زمانے کو
اور اِک چھینٹے سے اپنی
دونوں آنکھوں کو بھگوئیں
اور جُڑی پلکوں کو کھولیں
اور دیکھیں
کیسا منظر، گھُپ اندھیروں سے
اُبھر آیا ہے
رنگوں، صُورتوں، مَوجوں

ہواؤں اور شعاعوں سے بھرا منظر
جو شاید
خود ہماری بند آنکھوں میں
کہیں سویا پڑا تھا!

فروری ۲۰۰۸ء

کیسی یہ مخلُوق ہے!

کیسی یہ مخلُوق ہے جس نے
ایک اِک پھُول کو
پتّی پتّی کر ڈالا ہے
گلیوں اور بازاروں میں جو
راس رچاتے
دُھوم مچاتے پھرتی ہے
سیدھے خط اور گہری کھائیاں
جس کو مُطلق راس نہیں ہیں

لاکھوں ٹیڑھے قدموں میں
تقسیم ہُوئی ہے
یُوں لگتا ہے جیسے اُس نے
دھرتی کے پامال بدن پر
ناچ دِکھانا سیکھ لیا ہو!

اکتوبر ۲۰۰۷ء

نبض

اِک خرامِ ناز کا یہ سِلسِلہ
گرم شریانوں کے اَندر
نَبض کے قدموں کی صُورت
جانے کب سے دَم بہ دَم آباد ہے!
کیا عَجَب
قدموں کی ضربوں کا یہ پیہم سِلسِلہ
پُورے عالَم کے بدَن میں
پہلے دِن سے دَم بہ دَم آباد ہو!

کیا عجب نعلَین کی یہ چاندنی
اوِر چاندنی کی یہ سُبک آواز
ہر ذرّے کے اَندر سے
ہمیں چُھونے پہ مائل ہو
مگر ہم اَپنی شرَیانوں میں پھِرتی
چاپ میں کھوئے ہُوئے
اِس کائناتی چاپ کو
سُننے کے قابل ہی نہ ہوں!!

دسمبر ۲۰۰۷ء

THE BRAIN

کیسا اَنوکھا کمپیوٹر ہے

بھرا ہُوا پانی کا جیسے ایک کٹورا

یُوں لگتا ہے

پانی جیسے دیکھ رہا ہے

پانی جیسے سوچ رہا ہے

کیا ہے، کیوں ہے، کس کے لیے ہے!

خود ہی سوال اُٹھاتا ہے

اور خود ہی اَپنے اَندر جا کر

لپک جھپٹ کر
گھونگے موتی لے آتا ہے!

کیسا اَنوکھا کمپیوٹر ہے
چُپکے سے جَل پانی جس کا
گیس کی ہیئت اوڑھ کے
سارے عالَم پر چھا جاتا ہے
اَپنے رُوپ سرُوپ میں
یکسر کھو جاتا ہے
پرٗ آرام کہاں ہے اِس کو
چِھن بھر میں پھر
جَل پانی بن جاتا ہے
کیسا اَنوکھا کمپیوٹر ہے!!

دسمبر ۲۰۰۶ء

تیز تَر رَوشنی

تیز تَر ہو رَوشنی تو کچھ نظر آتا نہیں!

رات آتی تھی نظر
جب رَوشنی کی نَرم بُوندیں
آسماں سے لفظ بن بن کر ٹپکتی تھیں
زمیں پر نَرم گالوں کا
عَجَب مَنظر دِکھاتی تھیں
مگر پھر

ایک گہری شام کو جب
بجلیوں نے قُمقُموں میں بند ہو کر
آگ کے گولوں کی صُورت
رات پر یلغار کی
اور ہر طرف
بازار، گلیاں اَور گھر
اِس تیز ہوتی رَوشنی میں
مشعلیں بن کر جلے
تو رات کو بھی دیکھنا
دُشوار تر ہوتا گیا!

نومبر ۲۰۰۶ء

کاغذ

کسی بھی سمت جاؤ
فاصلوں کو پار کرنے کا
کوئی رستہ نہیں ہے
کہ اِک اِک سمت میں
نامُختتم پھیلاؤ کے
نقشے بچھے ہیں!

مگر یہ بھی تو دیکھو

قُرب اور دُوری جہاں اِک دُوسرے کے
رُوبرُو آکر رُکے ہیں
وہاں سِلوٹ سی اِک پیدا ہُوئی ہے
وہ سِلوٹ جس کے اَندر
دونوں عالَم جُڑ گئے ہیں!

عَجَب قِصّہ ہے
یُوں لگتا ہے، باہر اَور اَندر
ایک ہی کاغذ کے دو اَطراف ہوں!!

نومبر ۲۰۰۶ء

ایک منظر

چاند کے رتھ نے اُڑائی دُھول
اور پھر دُھول نے
چاروں طرف یلغار کی
پیڑ، فصلیں، مقبرے، سڑکیں
پہاڑوں کے کلَس
شہروں کے بھاری ڈھیر

سب پر
دُھول کی تہ دار جھلّی جم گئی

اوِر ہیئتیں، ساری کی ساری
اِک بڑی ہیئت کے اَندر
گُم ہُوئیں
پھر دُھول کا پَردہ سا جیسے تن گیا
اوِر سارا مَنظر
تھرتھرا کر تھم گیا!

فروری ۲۰۰۷ء

فلک دم بہ خُود تھا!

فلک دم بہ خُود تھا
کہیں کچھ ہُوا تھا
پرندے
بہت زور سے پھڑپھڑائے تھے
شہروں کے خستہ مکاں
دلِ گرفتہ مکیں
تھرتھرانے لگے تھے
شِکن در شِکن سرزمیں

شق ہُوئی تھی

عجب حشر کا اِک سماں تھا

مگر حشر کا رنگ بدلا ہُوا تھا

زمیں؛ کُہنہ لاشیں اُگلنے کو بیتاب

ہرگز نہیں تھی

زمیں؛ زِندہ نعشیں نگلنے کا

منظر دِکھانے لگی تھی!

اکتوبر ۲۰۰۶ء

کس نے دیکھا ہے!

بُھوری خاک کا طیش میں آکر
آگ اُگلنا
اور پتھر بن جانا
سب نے دیکھا ہے
ریزہ ریزہ ہو کر اِس کا
اُونچے نیچے ریت کے لرزاں ٹیلے بننا
یہ بھی سب نے دیکھا ہے
آندھی بن کر

اَندھی آنکھوں میں بھر جانا
یہ بھی دیکھا ہے اِن سب نے
جن کی آنکھیں نُورانی ہیں
خاک کا لیکن ایک وظیفہ اَیسا بھی ہے
جس کا ناظِر کوئی نہیں ہے
خاک کا ننّھے پھُولوں، ہنستے بچّوں
چھم چھم اُڑتے لفظوں میں
ڈھل جانا کس نے دیکھا ہے!

ستمبر ۲۰۰۶ء

اُکھڑ گئے سو اُکھڑ گئے!

جو اُکھڑ گئے سو اُکھڑ گئے
اَب اُن کا لَوٹ کے آنا
کِتنا مُشکل ہے!
برسوں بعد وہ لَوٹ بھی آئیں
تو کب لَوٹ کے آ پائیں گے
وُہ جس شاخ سے
ٹُوٹ گرے تھے
اُس پر جانے کتنی شاخیں

کتنے پھُول نکل آئے ہوں
جن کے نافے
اَجنبیوں کی خُوشبُوؤں سے
اَٹے پڑے ہوں
جن میں، جانے والوں کی
مَہکار میں بِھیگا —
اِک پنبہ بھی
بچ نہ سکا ہو!!

مارچ ۲۰۰۷ء

پیڑ کتنا بے کَل ہے!

پیڑ اور پرندے کی
دوستی پُرانی ہے
پیڑ چل نہیں سکتا
رہ گُزر سے لگ کر وُہ
جانے کب سے بیٹھا ہے
پتّوں اَور پھُولوں کا
تھال اُس کے ہاتھوں پَر
کِتنا اچھا لگتا ہے
دُور جاتے پنچھی کو

دَف بجاتے پتّوں سے

ڈال پر بُلاتا ہے

اُس کی بات سنتا ہے

اپنی کب سُناتا ہے

کیا پتا پرندے کو

پیڑ کتنا بے کل ہے

کتنے دُکھ اُٹھاتا ہے!

ستمبر ۲۰۰۶ء

مُراقِبہ

شِکستہ حال پیپل پر خموشی کا بسیرا ہے
لٹکتی ٹہنیوں سے برگ آسا چیتھڑے
چمٹے ہُوئے ہیں
تھکے پیپل کے پہلو سے جُڑا
اِک دَم بہ خود مَرقَد ہے
مَرقَد سے جُڑا اِک سُست رَو دریا ہے
پیپل خاک پر بیٹھا ہُوا ہے!

ہَوا کے لَمس سے

لہروں کی کروٹ
اور اگر بتی کی ریزش سے
وہ حد درجہ ہراساں ہے
مگر کچھ بھی ہو اُس کو
آخری ساعت تلک
بے دَرد سنّاٹے کو اوڑھے
دَم بہ دَم بیدار رہنا ہے
اُسے دریا کو اور مرقد کو، آخر
ایک دِن تو پار کرنا ہے!!

مارچ ۲۰۰۶ء

جھیلیں

اَپنے اَندر
اِک بے اَنت سمندر لے کر
کِس کِس دَر پر تم جاؤ گے
ہر دَر پر
اِک خالی جھیل نظر آئے گی
خالی جھیل کو بھر بھی دو گے
تو بھی تم سے کٹی رہے گی!

سب جھیلیں دریوزہ گر ہیں

اَپنے عکس میں گُم رہتی ہیں
پر جب خالی ہو جاتی ہیں
گہرے گھور سمندر کو
آوازیں دینے لگتی ہیں
اَور سمندر
بادل اوڑھ کے آجاتا ہے
کاسے اُن کے بھر دیتا ہے
اوِر وُہ اُس سے کٹ جاتی ہیں!

اِن جھیلوں کو کون بتائے
دھرتی کا موّاج سمندر
خود بھی جھیل ہے
جس کی اُوک کو بھر دیتا ہے
دُور آکاش کا نیلا ساگر
پھر بھی نیلے ساگر سے وُہ
کٹا ہُوا ہی رہتا ہے!!

اگست ۲۰۰۷ء

للک

ہر ایک شے کی
اِک اپنی خُوشبُو ہے
کچّی کلیوں کے لمس ایسی
جو بن کے پریکاں
لپک کے جاتی ہے
اُپنے دِلکش ہدف کی جانب!

تمام خُوشبُوئیں

ایک دُوجے کو ڈھونڈتی ہیں
مگر وہ جُل دے کے
تِتلیوں کو اُداس پھولوں کے
زرد تختوں میں گھومتی ہیں
وہ جذب ہونے سے ہیں گریزاں
کہ "فرق" اُن کو عزیز تر ہے
مگر کہاں اُن کو یہ خبر ہے
کہ مُشک کے اِک قدیم ساگر میں
رقص کرتی وہ مچھلیاں ہیں
لہکتے تہ دار نیلے ساگر
کے تن بدن میں
بس اِک تماشا دِکھا رہی ہیں!

اپریل ۲۰۰۶ء

SPECTRUM

ہر لمحہ، اِک بُوند ہے گدلے پانی کی
اوِ بُوند کے اَندر کتنے زمانے
جاگ رہے ہیں!
اِک وہ زمانہ
جس کو اَپنی پڑی ہُوئی ہے
جیسے اُس کے پیچھے
خُونی کُتوں کا اِک غول لگا ہو!
اِک وہ زمانہ
جو مَوجُود کی
بے پایاں گُنجلک کے اَندر

ہر دَم، گرہوں کے جالے میں

پھنستا جائے

ایک پہیلی بنتا جائے!

اور وہ زمانہ

جو اَپنے ہی گہراؤ میں جَست لگا کر

ٹوٹتے پتھر کی کرچوں میں

اَپنی اُس پاتال کو ڈھونڈے

جس کا کوئی نشان بھی

اَب موجود نہیں ہے!

اور پھر ایک زمانہ وُہ بھی

جس کے عُمق میں ایک خَلا ہے

اَور خَلا کے اَندر جانے کتنے خَلا ہیں

جن کے تہ دَر تہ پرتوں کے اَندر

سارے زمانے

آنکھیں کھولے، دَم سادھے

بے ہوش پڑے ہیں!!

اگست ۲۰۰۷ء

عَجَب اِک آتشیں تلوار

فلک نے میرے آگے بند باندھا تھا
بہُت خُوش تھا کہ اُس نے مجھ کو
پیلے بانس کے پنجرے میں
بے بس کر دیا تھا
مگر اُس کو کہاں اِس کی خبر تھی
میں کِرنوں کے پَروں والے پرندوں
کی گھنی ڈاروں میں ڈھل کر
بے محابا اُس کی جانب آؤں گا

اور اُس کے چہرے پر کھُدے
تاروں کے پھندوں سے گزر کر
اُس گھنیری تیرگی کو مَس کروں گا
جس کے سینے میں
عجَب اِک آتشیں تلوار
قرَنوں سے گڑی ہے
مِری جُرأت کو حیَرانی سے
تکتے جا رہی ہے!

مارچ ۲۰۰۸ء

تیرگی

چمکتی آنچ کچے کوئلوں کی
ڈرے سہمے ہُوئے
داغوں بھرے، ٹھنڈے
اندھیرے سے یہ کہتی ہے:
ترُّاریّ کو تو ُاوِ بھاگ
اَپنی جاں بچا!
چاروں طرف غاروں نے
مُنہ کھولے ہُوئے ہیں

اُن میں سَر اَپنا چُھپا
اور سانس روکے
تیرگی کی راہ کو
اِک تار بس تکتا ہی جا
اُس تیرگی کی —
جو خود اَپنے غار سے اِک دِن
نکل کر آئے گی
سینے سے چمٹا کر تجھے
ہر دَم لپکتی ترمَتی کی مثل
یک دَم
نیستی کے گھاؤ کے اَندر کہیں
لے جائے گی!!

ستمبر ۲۰۰۸ء

چُلّو بھر پانی

پہاڑوں سے اُتر کر
لڑکھڑاتا تیز رَو پانی کا دھارا
آپ خود اَپنے لیے رَستہ بناتا ہے
نشیبِ ارض کو بھرنے
کُھلے مَیدان میں
اِک تُند گھوڑے کی طرح
کف دَر دَہاں
بڑھتا ہی جاتا ہے

گھروں کو نوکِ پا سے توڑتا
باغوں سے ٹکراتا
سِیہ ٹیلوں کو جُل دے کر
کسی اَن دیکھی منزل کی طرف
کِھنچتا ہی جاتا ہے
مگر جس دم،
نشیبِ ارض کے پھیلاؤ کو
وُہ سامنے پاتا ہے
جو پہلے ہی پانی سے بھرا ہے
تو نادِم ہو کے،
خود چُلّو میں اَپنے
ڈوب جاتا ہے!

جولائی ۲۰۰۸ء

خواب

پَو پھٹے
تُو نے سُبک خوابوں
کے سب بکھرے پَروں کو
ڈھیر میں تبدیل کر کے
صحن کے مرکز میں ایسے رکھ دیا ہے
جیسے وُہ اُڑنے کے قابل ہی نہ ہوں

تجھ کو ہم کیسے بتائیں

خوِاب آخر خوِاب ہیں

تقسیم ہو جائیں تو اُن کی قوّتِ پرواز

اِتنی تیز ہو جاتی ہے، وہ

ہست کے بے اَنت کو

اِک پَل میں کر لیتے ہیں طے

اَور پھر جُڑ کر

عجَب تہ دار سا اِک خوِاب

بن جاتے ہیں جس کی

آخری تہ تک پہنچنے کے لیے

زینے ہی زینے ہیں

تجھے کیسے بتائیں ہم!!

اکتوبر ۲۰۰۸ء

خُوشبُو

گھنی خُوشبُو کا بدبُو نام رکھنا
کِتنا آساں ہے!
مگر خُوشبُو کا اِس میں دوش کیا ہے
ہَوا گر ساتھ اِس کا چھوڑ جائے
تو رس خُوشبُو کا گاڑھا ہو کے
نتھنوں تک پہنچتا ہے
بَہُت کڑوا وہ لگتا ہے!

گھنا جنگل کہ مَرقَد ہے
کوئی رَستہ بھی اُس کی گردِشوں کے
بے جہت گرداب سے باہر نہیں جاتا
وہ چاروں اور سے محبُوس
بس اَپنی ہی بدبُو کے نشے میں
غرق رَہتا ہے!
چمن، سیدھے مُعَطّر
راستوں کا اِک عَجَب مامَن
ہَوا اُس سے گزرتی ہے تو بھینی باس کو بھی
ساتھ اَپنے لے کے جاتی ہے
تبرک ہر جگہ تقسیم کرتی ہے
ہَوا خُوشبُو کا آنچل اوڑھ کر چلتی رہے
تو خود بھی خُوشبُو ہے
رُکے تو سُوکھتے جوہڑ کی کیچڑ میں دھنسا
اِک چیتھڑا ہے!!

اپریل ۲۰۰۷ء

گُم آندھی

زمانے، سانس لینے دے ہمیں
کیوں سُرخ آندھی کی طرح
تُو نے فضا میں کر لیا خود کو
مُعلّق
اور گھنے ذرّوں کی چادر
اوڑھ لی اَپنے بدَن پر!
ترے قدموں سے ہم
اَپنے قدم جوڑے

نہ جانے کب سے چلتے آرہے تھے
مگر اَب تیرے شَل قدموں نے
ہم سب کو مُعطّل کر دیا ہے!
زمانے، تُو قدم اَپنے اُٹھا
آندھی کو خود رَستہ دِکھا
ذرّات بکھریں
سانس کی رَو چل پڑے
فالج زدہ، دُھندلی فضا تحلیل ہو
اورِ ہم —!!

جون ۲۰۰۷ء

یہ ریکھائیں

یہ ریکھائیں کہ مُٹھی کی
کٹوری میں پڑی ہیں
کبھی لیکوں کی صورت
اُنگلیوں کے چاک سے باہر کو لپکی تھیں
بہت روکا
مگر رُکنا اُنھیں آتا نہیں تھا
نظر کی ڈور سے چپکی
زمیں پر رینگتی

لکڑی کے خستہ گیٹ سے آگے
کُھلے رستے سے جُڑ کر
دُور تک بڑھتی گئی تھیں
ٹریفک کا عَجب اِک رش تھا جس نے
تیز پہیوں کے تلے رَوندا اُلتاڑا
پُرزے پُرزے کر دیا اُن کو
ہَوا اِک خَستہ ننگی شاخ پر بیٹھی
نہ جانے کب سے اُن کی منتظِر تھی
سیہ وحشی پرندے کی طرح اُن پر گری
پھر دیکھتے ہی دیکھتے ـــــ

کتنے زمانوں بعد اَب
لَوٹی ہیں ریکھائیں مِری مُٹّھی میں
اِن کا کیا کروں مَیں !!

جنوری ۲۰۰۷ء

چلو ہم بھی وہاں پہنچیں!

چلو ہم بھی وہاں پہنچیں

جہاں ہونٹوں کے دونوں پَٹ

لرزتی چُپ کا اِک منحوس بندھن بن گئے ہیں

پرندوں کی طرف نظریں اُٹھائیں

تو فلک کو چُھونے والی بلڈنگیں نظروں کو روکیں

لِفٹ میں نظروں کو واپس خاک پر لائیں

جہاں کیڑے مکوڑے رات دِن گردِش میں ہیں

اور رِزق کے ریزے جہاں

چاروں طرف بکھرے پڑے ہیں
قافلوں کے پھول
باسی پتّیوں کی ریزگاری بن گئے ہیں
سیہ سڑکوں پہ
جانے کس نگر کو ڈھونڈتے ہیں!
عجب جالا ہے آنتوں کا
کہ جس میں شہر سارا
دھنس گیا ہے
تھکی نظریں بھی جالے کی
لرزتی مٹھیوں میں بند ہو کر رہ گئی ہیں!!

جنوری ۲۰۰۷ء

ASTRAL FEELING

چلا کہاں سے رُکا کہاں پر
وہ کیسا خم دار
سِلوٹوں سے بھرا سفر تھا
پہاڑ رستے میں بچھ گئے تھے، پرند بھی
ہم سفر نہیں تھے
نہ جانے کب مَیں زمیں سے اُڑ کر
فلک کے اَن دیکھے
راستوں پر نکل گیا تھا!

ہَوا کے ساگر نے

مجھ کو اُوپر اُٹھا لیا تھا

زمیں کی گُدڑی کے سارے پیوَند

اَپنے اَندر سمٹ گئے تھے

سِتارے اَب میرے رُوبرُو تھے

سِتارے، جیسے

کروڑوں اَربوں لپکتے جُگنُو

کہ زَرفشاں تھے!

مگر ستارے بھی ہَولے ہَولے

سمٹ رہے تھے

سَفَر نے بے اَنت رَوشنی کا

سفید چوغہ پہَن لیا تھا

کوئی بھی رَستہ نہیں بچا تھا

سَفَر، حُدُودِ سَفَر سے

آزاد ہو گیا تھا!!

اگست ۲۰۰۵ء

کیتھارسس

وُہ سُورج ہے
صُبح سویرے، سامنے والی مَٹی پر
ہر روز دِکھائی دیتا ہے
سَہجے سَہجے قدم اُٹھاتا
میرے کمرے کی کھڑکی پر
دَستک دیتا، دھم سے
کمرے کے اَندر آ گرتا ہے
وَرَق وَرَق ہونے لگتا ہے!

مَیں مُورکھ، اِک ایک وَرَق پر
اَپنے بھیگے دُکھڑے لکھنے لگتا ہُوں
اور وُہ اِک اِک کر کے
سارے دُکھڑے پڑھتا جاتا ہَے
شام تلک، دُکھڑوں کی جیسے
ایک کِتاب سی بن جاتی ہَے
تَب وہ کِتاب اُٹھا کر
میرے کمرے کی کھڑکی سے
جَست لگا کر
رات کے گہرے ساگر میں
بے خَوف اُترنے لگتا ہَے
ساگر کے بے اَنت دُکھوں میں
میرے دُکھڑے شامِل کر کے
دِھیرے دِھیرے بُجھ جاتا ہَے!

اکتوبر ۲۰۰۸ء

اِک چلتی پھِرتی پرچھائیں

بس اِک ریشم کی کچّی ڈور ہے
جس نے مجھے
میرے بدن سے باندھ رکھا ہے!
بدَن میرے تعاقُب میں
برہنہ پا روانہ ہے
اِسے معلُوم ہے، ریشم کی
کچّی ڈور کی اَوقات ہی کیا ہے!

سو پھُولے سانس کو

سینے میں روکے چل رہا ہے!

مجھے لیکن کسی بھی ڈور کی

حاجت نہیں ہے

مری نظریں اُفُق کی لیک پر مرکُوز ہیں

چمٹی ہُوئی ہیں

اُفُق جو چلتی پھرتی ایک پرچھائیں ہے

پرچھائیں جو اُلٹے پاؤں

چلتے جا رہی ہے

مُسلسَل مُلتوی ہونا ہی جس کے

ہاتھ کی ریکھاؤں پر لکّھا ہُوا ہے!!

اکتوبر ۲۰۰۸ء

TRANSLATIONS OF WAZIR AGHA'S POEMS

1.**Selected Poems of Wazir Agha,** English, 1978
Selected by Jamil Azar and Mushtaq Qamar

2.**Half a Century Later,** English, 1989
Translated by Rajinder Singh Verma

3.**Half a Century Later,** Hindi, 1983
Translated by Sheen Kaaf Nizaam

4.**Half a Century Later,** Danish, 1998
Translated by Naseer Malik

5.**Half a Century Later,** Punjabi, 1994
Translated by Raaz Santokh Sri

6.**A Tale so Strange,** English, 1992
Translated by Wazir Agha

7.**A Tale so Strange,** Greek, 1994
Translated by Danae Papastratou

8.**A Tale so Strange,** Swedish, 1995
Translated by Eva M Alander

9.**Winds of Fire,** English, 1994
Translated by Muzaffar A. Ghaffar

10.**Seven Poems of Wazir Agha,** English
Translated by Azad Gulati

11.**Poems, Mild and Mellow,** English, 1997
Translated by Satyapal Anand

12.**Selected Poems of Wazir Agha,** English, 1998
Edited by Saleem Agha
Introduction: Prof. Magnus Rohl, Stockholm Uni.

13.**Selected Poems and Haiku,** Norwegian, 2004
Translated by Afzal Abbas and Paul Erik Norton

14.**Let the String Vibrate,** English, 2001
Translated by Wazir Agha

15.**Poems and Haiku Poems,** English, 1999
Translated by Wazir Agha

16.**Is Anyone out there,** English, 2000
Translated by Wazir Agha

17.**Late Showers,** English, 2003
Translated by Wazir Agha

WAZIR AGHA'S POEMS IN ANTHOLOGIES

1.**Qnros,** Greek, International Anthology, 2005
Three poems translated by Zoe Savina

2.**Haiku,** Greek, International Anthology, 2002
Ten Haikus translated by Zoe Savina

3.**Babilonia,** Italian, World Anthology, 2005
Four poems translated by Bruno Rombi

4.**Siscrive,** Italian, World Anthology, 2002
Twenty poems translated by Bruno Rombi

کاغذی پیرہن
KAGHADHI PERAHEN

ISBN 978-969-8527-75-4